آسیہ رزاقی

ناولٹ

نائی کالونی، عرف ساسوں کی چھاؤنی میں خاموشی
پھر اندھیرا ہو گیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے
تھے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب نائی کالونی کی
مومائیاں، عشا کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے
بستروں پہ چلی جاتی تھیں اور سوجاتی تھیں۔
ان کا کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی لاکھوں نعمتوں
ایک 'رات' آرام کے لیے بنائی ہے۔ لہٰذا رات کو
آرام کرنا چاہیے ۔ ورنہ کفران نعمت
جانے اور دیگر مشاغل کے لیے پورا دن ہوتا ہے
ہم بھی کیا کریں۔ پورے دن دفاتر کی تھکان دینے
محنت، دماغی مصروفیات کے بعد گھر آکر سوائے
ڈھے جانے اور کچھ نیند لینے کے سوا کوئی
ہی نہیں سوجھتا۔ لہٰذا رات کو سب تازہ دم
اور پھر محفل جمتی، چھٹی کے دن تو پورا وقت ہی ہمارا ہوتا۔

اس روز ساسوں کی چھاؤنی کرفیو ہٹا لیتی اور ہم آزادی کے احساس سے خوب سرشار، شور شرابا کرتے، لڑائی جھگڑا، دھول دھپا کیا نہیں ہوتا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات ساسوں کی چھاؤنی کی طرف کھڑکی سے اندھیرا جھانکنے لگا۔

تب امتیاز عرف تازی دبے پاؤں چلتا ہوا، عرفان عرف عفی کے کمرے میں آیا۔ باہر سے ہی اس نے جھانکا اور ماحول کا جائزہ لیا۔ عفی آرام کرسی پر بیٹھا ایک فضول سی کیسٹ کی غزلیں سن رہا تھا اور جھوم رہا تھا اس سے پہلے کہ تازی اس کو پکارتا عفی نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی اور اچانک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کی نظر تازی پر پڑی۔ وہ زور سے بولا۔

"ساڑھے آٹھ۔"

یہ آواز ساتھ کے تمام کمروں میں سنی گئی۔ پل بھر میں سب اکٹھے ہو گئے۔ سڑک کی سمت کھلنے والی کھڑکیاں کھول کر وہ اطمینان سے فرش پر بیٹھ گئے۔ کیسٹ لگا دیے گئے اور کھیل شروع ہو گیا۔ وہ برج کھیل رہے تھے۔ عفی، تازی، میں اور نورالدین عرف زنگی عرف گھوڑا۔ دراصل وہ پہلے گھوڑا نہ تھا۔ اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے زنگی کہلاتا تھا۔ وہ عجب مستانہ سی چال چلتا۔ پیر ادھر ادھر پھینکتا ہوا، جھومتا ہوا۔ ہم لوگ تو اسے جیری لیوس کہہ کر مطمئن بلکہ مسرور ہو جاتے۔ وہ بھی اس نام سے مطمئن اور مسرور ہو جاتا۔

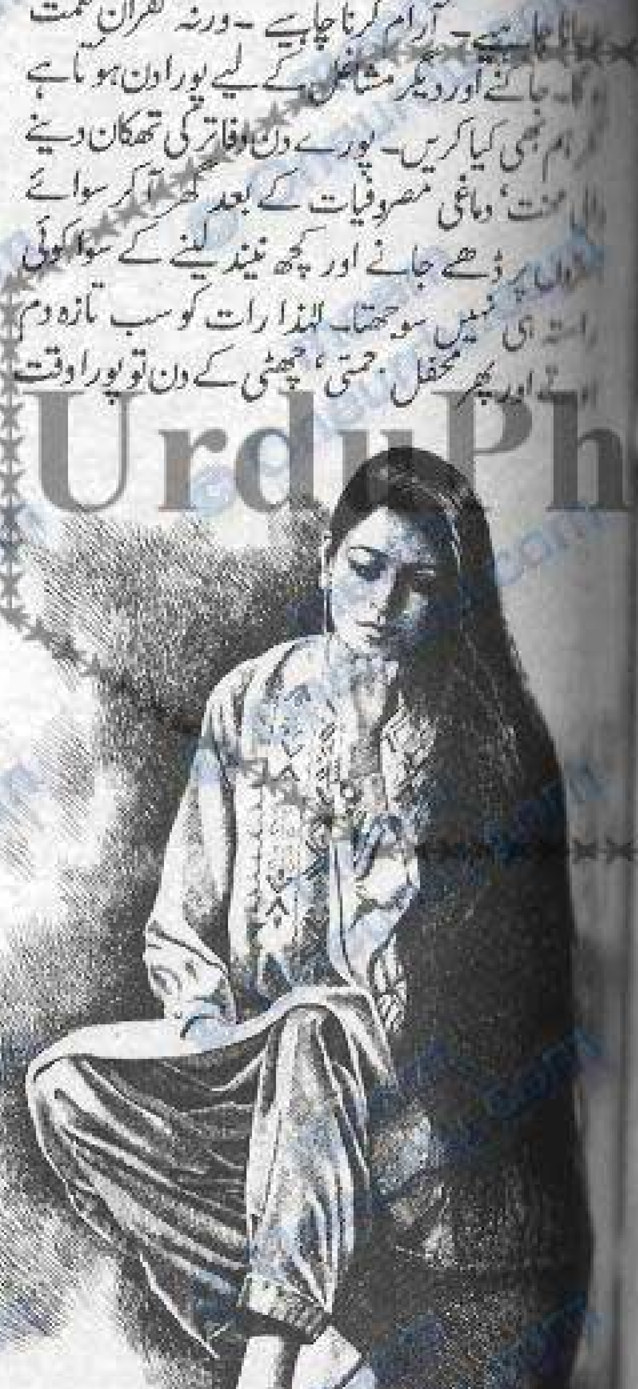

مگر جب سے فریدہ عرف فرو ہمارے گروپ میں شامل ہوئی اس کی تحقیق اور مشاہدے کو ٹھکرانا یا رد کرنا اتنا سہل نہ تھا۔ لوگوں کے نام رکھنا، نقلیں اتارنا اس کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ فرو مجیب عرف مجی کی بیوی تھی۔

اب سے کچھ دن پہلے تک مجی بھی ہم لوگوں میں

شامل تھا۔ اس کا بھی گھر تھا نہ گھاٹ۔ عقی اسے لایا تھا۔ مجھی سروس کی تلاش میں تھا۔ اسے سروس مل گئی کیونکہ کرنل پو کر اس پر مہربان ہو گیا۔

کرنل ہمارے گھر سے کچھ پہلے ایک فراخ سے گھر کا مالک تھا۔ اپنے گھر آنے کے لیے لامحالہ ہمیں کرنل کے گھر کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا' اور وہ اپنے گھر کے لان میں پائپ سے پانی دے رہا ہوتا۔ تو ہم سے ہیلو ہیلو کرنا نہ بھولتا۔ ایک پائپ اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ دوسرا دانتوں کے درمیان اور اس کے چہرے کی مشفق مسکراہٹ دل جیتنے کے لیے کافی ہوتی۔ اس کے لان کی سرسبز باڑھ اتنی نیچی تھی کہ وہ سڑک اور اس کے گزرنے والوں کی نگرانی بہ آسانی اور بخوبی کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نانی کالونی عرف ساسوں کی چھاؤنی کے تمام مکینوں سے بخوبی واقف تھا۔

ہم یعنی ہمارا پورا گروپ نانیوں کا پے انگ گیسٹ تھا۔ نانی کالونی کی بلڈنگ کے تین حصے تھے۔ جتنا بڑا خاندان تھا۔ اسی حساب سے مکانیت بھی تھی۔ ایک حصہ جو ہماری بلڈنگ کے سامنے تھا۔ دراصل نانی کالونی وہی تھی۔ جس میں پورا خاندان رہتا تھا باقی حصہ کرائے پر تھا۔ تو سامنے والا حصہ نانی الفتی کا تھا۔ بختیار کی پرنانی کا بختیار بھی ہمارے گروپ کا تھا لیکن وہ صرف چھٹی کے دن ہمارے گیمز میں شرکت کرتا تھا۔ شاید اسی کی وجہ سے ہمیں گلی میں ہر قسم کے شور شرابے کی اجازت تھی۔ بختیار بہت پیارا لڑکا' اور اپنے گھر کے سبھی افراد کا لاڈلا تھا۔ ہماری بلڈنگ نانی الفتی کی بہن اور سگی دیورانی نانی اشرفی کی تھی۔

اور ہماری بلڈنگ کے دائیں سمت' نانی الفتی کی بلڈنگ کے بائیں طرف۔ گلی کے بالکل سامنے والی بلڈنگ جو گلی کو بند کردیتی تھی۔

نانا سید مختار شاہ کی تھی جو تمام تر کرائے پر اٹھی ہوئی تھی۔ اور نانا مختار جو نانی الفتی کے سگے بھائی تھے۔ نانی الفتی کے کرائے دار تھے۔ نانی اشرفی بھی نانی الفتی کے ساتھ رہتی تھیں۔ دونوں بہنوں نے خاندان کے تمام لوگوں کو اپنے گھر کے کابک میں جگہ دے رکھی تھی۔ بختیار کی نانی' بختیار کے والدین' بختیار کی [illegible] مصطفائی بیگم اور ان کے بیٹے مرتضیٰ اور اصطف [illegible] ان کی فیملی' ماموں جان' موبائی جان پھر بختیار کی نانیاں تھیں۔ یعنی الفتی نانی کی تین بیٹیاں۔ ایک بختیار کی نانی تھیں۔ دوسری بڑی نانی اور چھوٹی نانی سید مختار شاہ کی اولاد بھی تھی اور نانی اشرفی کی اولاد بھی۔ غرض پوری کالونی' قبیلے کو آغوش میں سموئے ہوئے تھی۔ عید بقر عید پر ان کے مردوں لڑکوں کی جو نفری ایک کے بعد ایک نکلنی شروع ہوتی تو یوں لگتا کہ عید گاہ یہی ہے۔ پوری گلی بھر جاتی۔ جتنے قاعدے اور اصول نانی کالونی میں برتے جاتے۔ اتنی ہی بے قاعدگی ہم لوگ روا رکھتے۔ اعتراضات کا سلسلہ بڑھتا جاتا بختیار پیامبر ہوتا۔

"نانی جان نے کہا کہ... بڑی نانی کہہ رہی ہیں کہ چھوٹی نانی کہہ رہی ہیں۔"

غرض ہر نانی کو [illegible] سے شکایت رہتی تھی [illegible] ریڈیو زور سے سنتے ہیں۔ ریکارڈ بہت فضول [illegible] ہیں۔ ہم شور کرتے ہیں۔ ان کے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ ہم سارے نل کھول دیتے ہیں اور ان کے نلوں کا پانی بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہم نل کھول کر بھول جاتے ہیں بعد میں پانی بہتا رہتا ہے۔ ہم چھت پر پتنگ اڑاتے ہیں۔ ان کے گھر کی بے پردگی ہوتی ہے۔

غرض شکایتوں کا سلسلہ طویل تھا۔ اور آخر میں دھمکی۔ گھر چھوڑ دو۔

اور یہیں ہم ڈر جاتے' ہار جاتے۔ اتنا اچھا مکان ہمیں ملنے کی امید تھی۔ نہ ہی اس قدر اطمینان بھری زندگی گزارنے کی سہولت ممکن تھی۔

صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا ہمیں نانی کالونی سے موصول ہوتا۔ شام کو جو بھی گھر پہنچ جاتا اسے شام کی چائے بھی مل جاتی۔ کبھی کبھی تھکے اعصاب کو سکون دینے کی خاطر کوئی بے وقت چائے کی فرمائش کرتا تو ادھر سے انکار نہ ہوتا۔ ایسی آسان زندگی کہاں ممکن

[illegible] الفتی کا خانساماں جو خود بھی بوڑھا تھا مگر نانی کو اماں جی کہتا تھا۔ صبح اور رات کو [illegible] میں ناشتہ اور کھانا لے کر آتا اور سب کے [illegible] میں پہنچا آتا۔ کبھی سب الگ الگ کھا لیتے کبھی [illegible] بیٹھ کر پھر دوسرے کھانوں کا سروے ہوتا۔

"[illegible] سالن میں بوٹی بڑی ہے۔"

"[illegible] دال پر گھی کا بگھار زیادہ ہے۔"

[illegible] قسم کے شکوے اور پھر روٹھ جانا۔

[illegible] کو کھانا پسند نہیں تھا۔ اس کے بقول اس کی [illegible] لذیذ کھانے پکاتی تھیں۔ اسے بڈھے [illegible] سے ضد ہو گئی۔ وہ ہر روز اس سے الجھتا۔

"[illegible] زیادہ ہے۔"

"[illegible] کم ہے۔"

"[illegible] زیادہ ہے۔"

"[illegible] کم ہے۔"

[illegible] کر کہتا۔

"[illegible] کوئی زندگی ہے۔ فضول قسم کے کھانے [illegible] ناشتا کر کے دن گزارا ہو۔"

نانی الفتی ہر طرح کا کھانا پکواتی تھیں۔ مرغ مچھلی بھی' گوشت' سبزی' کباب' کوفتے' کم از کم [illegible] کبھی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ شاید اس لیے کہ [illegible] نے اپنا بچپن عسرت میں گزارا تھا۔ اور کبھی شکایت نہ کرنے والا نور الدین زنگی بھی تھا [illegible] نہیں جھکا کر ہر قسم کا کھانا چٹ کر جانے والا تھا۔ [illegible] بدمزہ سالن ہوتا تو اسے کچھ پتا نہ چلتا۔ سب کے [illegible] کرنے پر وہ لاپروائی سے کہتا۔

"[illegible] ہی ہے جتنے پیسے ہم دیتے ہیں اس میں اور [illegible] سکتا ہے۔"

[illegible] کسی دن کھانا بہت لذیذ ہوتا تب بھی وہ اسی [illegible] سے کھاتا۔ وہ نانی کی پابندیوں سے کم ہی بیزار [illegible] رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہم ایک جگہ جمع ہو [illegible] سنتے' کوئی کھیل کھیلتے یا صرف گپیں ہانکتے [illegible] سب سے پہلے اٹھ کر چلا جاتا۔ کچھ دن پہلے تک وہ رات کو زیادہ دیر تک جاگنے والا فرو تھا۔ مگر اب' فرو کی آنکھ کے اشارے پر وہ جمائی لیتا ہوا اٹھ جاتا۔

اس نے شادی صرف اس لیے کی تھی کہ وہ نانی کالونی کے بوڑھے خانساماں کے ہاتھ کے پکے ہوئے بدمزہ کھانوں کو مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اب بھی ہم مجیب کے قسم قسم کے منہ بنانے کے انداز کو یاد کر کے ہنس پڑتے ہیں۔ جو وہ کھانا کھانے کے دوران بڑی محنت سے بناتا تھا۔

فرو کے آنے کے بعد پہلا کام اس نے یہی کیا کہ نانی الفتی کو بختیار کے ذریعے کہلوا دیا کہ آئندہ اس کے لیے کھانے کی تھالی نہ لائے۔ وہ کمرے کا کرایہ دیتا رہے گا۔ مگر اب ہوتا یہ تھا کہ جب ہمارا کھانا آتا تو وہ ہم سے پہلے موجود ہوتا اور سب کے ساتھ کھانے میں حصہ بٹاتا بلکہ تعریف کرتا اور داد دینے میں کوتاہی نہ کرتا۔

اس معاملے کے ہم سب گواہ تھے کہ فرو انتہائی بدمزہ کھانا پکاتی تھی۔ مجیب نے شروع میں جوش میں آ کر ہم سب کی دعوت کر ڈالی تھی اور ہم سب اس کے کمرے سے "تقریباً" بھوکے اٹھ آئے تھے اور اپنے کمرے میں رکھے کھانے کو (جو بوڑھا خانساماں رکھ کر چلا گیا تھا) انتہائی رازداری سے کھانے لگے۔ پتا چلا کہ ہم ہی نہیں مجیب بھی ہمارے ساتھ اسی رازداری سے برابر کا شریک رہا۔ اب وہ روز فرو سے لڑتا تھا۔ میں اور نور الدین زنگی ان کے درمیان مصالحت کراتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت والے روز نور الدین زنگی ہی وہ واحد مہمان تھا جو فرو کے ساتھ میز پر آخر تک شریک رہا۔ اس کا کھانا مجیب نے کھایا جو نانی کالونی سے آیا تھا۔

ہم جسے نانی کالونی کہتے تھے فرو نے اس کا نام ساسوں کی چھاؤنی رکھ دیا تھا۔ فرو کی ایک دور کی عزیز نانی کالونی کے کسی گھر کی بہو تھی۔ دراصل فرو نے نانیوں کے نا انصاف ظالم اور سنگدل ہونے کا پروپیگنڈا اسی عزیزہ کی وجہ سے کیا تھا۔ وہ اکثر اپنی اس بہن سے ملنے اس کے

گھر جاتی اور واپس آکر گلناز کے جذبات اور تجربات کو آشکار کرتی۔

''گلناز کی ساس اتنی ظالم ہے کہ بس بے چاری کو پیٹ بھر کھانا بھی نہیں دیتی اور سارا دن کام میں مشغول رکھتی ہے۔ نہ آرام کرنے دیتی ہے نہ اسے ہنسنے کھیلنے کی اجازت ہے۔''

''کون ہے گلناز کی ساس؟'' مجی نے پوچھ لیا۔

ہم نانی کالونی کی تمام نانیوں، موانیوں کو جانتے تھے۔ مگر گلناز کی ساس کو نہیں پہچانتے تھے۔

''بختیار کی چھوٹی نانی۔'' فرو نے بتایا۔

''ارے وہ؟'' ہم حیران رہ گئے۔ اتنی سوکھی، مری گھلی سانس لینا بھی بے چاری کو مشکل لگتا تھا۔ وہ ظلم کیسے کر سکتی ہے مگر فرو کو جھٹلانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ مجی میں بھی نہیں۔

خود گلناز گوشت کا پہاڑ تھیں انہیں تو حرکت کرنا بھی دشوار تھا۔ وہ پیٹ بھر کر کھانا نہ کھانے کے باوجود اس قدر تندرست تھیں ہم مزید حیران ہوگئے۔

مجی اور فرو میں آئے دن جنگ ہوتی۔ فرو کو باتیں کرنے، نقل کرنے اور لوگوں کا مضحکہ اڑانے کا شوق تھا۔ وہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی۔ مجیب کے دفتر سے گھر آنے کا انتظار کرتی رہتی۔

''ذرا سایہ کردیں۔ ذرا سادہ کردیں۔''

''تھک گئی ہوں میں۔ ذرا چائے بنادیں۔''

''کپڑے دھلے رکھے ہیں۔ باہر ڈوری پر ڈال دیں۔''

وہ ہر قسم کے کام مجیب کے لیے وقف رکھتی۔ مجیب کر تو دیتا مگر بعد میں خوب لڑتا۔ وجہ ایک ہی تھی بدمزہ کھانا۔

فرو مجبور ہو کر بول اٹھتی ''رکھ لو کوئی خانساماں مجھ سے نہیں ہوتا۔'' مجیب بھنا جاتا۔

''تم سے ہوتا کیا ہے۔؟''

فرو کا منہ پھول جاتا۔ وہ اپنی تعریف سننا پسند کرتی تھی۔ تنقید پر خفا ہو جاتی تھی۔

امتیاز اس کی تعریفیں کرتا رہتا۔ کھانے کی نہیں تو امتیاز سے بہت خوش تھی۔ نورالدین زنگی کی تمام نیاز مندی کے باوجود وہ اس سے خفا رہتی۔ نورالدین تعریف کے معاملے میں کافی بخیل تھا۔

کبھی وہ نیا لباس پہن کر ہمیں دکھاتی۔ ''میں کیسی لگ رہی ہوں نا بھدا تو نہیں ہے یہ۔ نیا فیشن نے......''

''واہ جچ رہی ہیں بھابھی۔'' تازی بغیر دیکھے ہی تعریف دیتا۔

''لگتا ہے آپ کے لیے ہی ڈیزائن ہوا ہے۔'' بھی بول پڑتا۔

فرو قبول صورت اور اسمارٹ تھی۔ وہ میک اپ بھی خوب کرتی تھی۔ حاضر جواب اور بذلہ سنج مجھے تو اس کی ایک خامی ہی ہر خوبی پر بھاری نظر آتی کام چور تھی۔ اس نے اپنے میکے میں کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس لیے اسے کچھ بھی نہیں آتا تھا البتہ باتیں بنانا، قہقہے لگانے میں ماہر تھی۔

ایک دن وہ گلناز سے مل کر آئی تو بہت خفا تھی۔ اس نے بتایا کہ گلناز کی خلیا ساس کہ ممیا ساس پتا نہیں ساس نے اس کو نصیحت کی ہے کہ وہ غیر مردوں کے سامنے بیٹھ کر اتنی زور سے نہ ہنسا کرے کہ اگلے گھر تک آواز پہنچے۔ انھوں نے سمجھایا ہے کہ وہ مردوں کے درمیان بیٹھا ہی نہ کرے۔ کیونکہ مردوں کے شیطان کے کارندے ہوتے ہیں اور وہ گناہ پر اکساتے ہیں۔

فرو بہت خفا تھی کہ اب وہ گلناز سے ملنے نانی کے نہیں جائے گی۔ جہاں سے مارشل لا قوانین کا اسی پر اطلاق ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فرو کے آنے کے کچھ دن بعد ہی نانی نے مجیب کو بلا کر سمجھایا کہ اپنی بیوی کو لے کر کسی اور مکان میں چلا جائے۔ مردوں پر بھروسہ نہ کرے عورت کا وہ بھی تنہا عورت کا اتنے کنوارے مردوں کے بیچ رہنا مناسب نہیں۔

مجیب مجبور تھا اسے اتنے کم کرائے پر مکان نہیں مل سکتا تھا اور وہ محلے میں فرو کو تن تنہا چھوڑ کر مطمئن بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں وہ ہم پر بھروسہ کرنے کے لیے مجبور تھا۔

نانی کالونی میں اتنے افراد تھے کہ فرو کو تنہا کہنا زیادتی ہوگی۔ وہ سب اس گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تو تھے۔

ایک روز بختیار نے آکر کہا کہ نانی کہتی ہیں۔ ''آپ اپنے کمروں کی کھڑکیاں بند رکھا کریں۔ رات میں بجلی کے بلب کی تیز روشنی ان کے کمرے میں بھی جاتی ہے اور نانی کی نیند خراب ہوتی ہے۔''

حکم سن کر ہم چپ ہو گئے۔ رات کو ہی تو ہم اکٹھے ہو کر زندگی کے تلخ مسائل بھلا کر حال کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ گپ شپ کھیل یا لطیفے بازی۔ کبھی بیت بازی اور کسی دن عفی موڈ میں ہو تو وہ اور تازی قوالی بھی کرتے تھے۔ فرو اور مجیب جھوما کرتے۔ اب اگر ہم کھڑکیاں بند کر دیں تو گرمی کے مارے دم گھٹ جائے گا۔ اب ایک گلی پار کر کے ہمارے کمرے کی روشنی نانی کے کمرے میں پہنچ کر ان کی آنکھوں کو تکلیف پہنچاتی ہے تو ہم چپ رہنے کے اور کرتے بھی کیا.....؟ بختیار نے ہمیں پریشان دیکھ کر وضاحت کی۔

''اصل میں نانی چاہتی ہیں کہ آپ لوگ دیر تک جاگا نہ کریں۔ وہ کہتی ہیں کہ دیر تک جاگنے والے اور دیر تک سونے والے شیطان کے ساتھی ہوتے ہیں جو لوگوں کو عبادت سے روکتے ہیں۔ جب جلدی سو ئیں گے ہماری طرح، تو جلدی اٹھا بھی کریں گے نانی کی طرح، پھر کبھی تو عبادت کا خیال آہی جائے گا۔ میرے ابا کی طرح۔''

مجیب کا کمرہ ہمارے کمروں کے مقابل تھا۔ یعنی صحن کے اس طرف اور اس کے کمرے کی روشنی صحن تک تو آتی تھی اس کے بعد نہیں۔ عفی نے مجیب سے درخواست کی کہ وہ کمرہ بدل لے اور ہماری محفلیں اس کے کمرے میں منعقد ہوں۔ جس سے بھی بدلا جائے کیونکہ ہمارے تو چاروں کمرے گلی کی سمت تھے۔ ہر کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔

''آپ لوگ اس قدر ڈرتے کیوں ہیں نانی سے؟'' فرو نے بگڑ کر کہا۔

''وہ آپ کی سگی نانی تو نہیں ہیں۔ مالک مکان ہیں۔ ان کے ہر حکم کی تعمیل کر کر کے آپ لوگوں نے دماغ بہت اونچے کر دیے ہیں۔ کبھی الفتی نانی کا آرڈر مانا جا رہا ہے تو کبھی اشرفی نانی کے اشارے کی تعمیل ہو رہی ہے۔ کبھی نانا مختار کا حکم چل رہا ہے۔ ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔''

''بھئی یہ سب بزرگوں کا درجہ رکھتے ہیں اور کوئی غیر واجب فرمائش تو کرتے نہیں۔'' میں نے سمجھایا ''اگر ہم ہی ذرا سا جھک جائیں گے تو بے عزتی نہیں ہو جائے گی۔''

''کمال ہے کرایہ دیتے ہیں۔ بغیر کرائے کے تو نہیں رہتے جو وہ رعب جماتے رہیں اور ہم سر جھکاتے رہیں۔''

''تو آپ کو ان کے احکام منظور نہیں؟'' مجیب نے فرو سے پوچھا۔

''بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔'' فرو جوش میں آ گئی۔ ''میں تو ان سب کو مزا چکھا دوں گی۔ سارے بڈھے اور بڑھیاں ایک جگہ جمع ہو کر ہمارے خلاف صف بندی کرتے ہیں۔''

''اچھا تو آپ ان کا یہ گھر چھوڑ دیں۔'' مجیب نے سادگی سے کہا۔

''کیوں کرایہ دیتی ہوں میں، مفت میں تو نہیں رہتی۔''

''بالکل درست یہ کرایہ کہیں اور دیا کریں۔'' فرو چپ ہو گئی۔ پانچ کمروں کا پورا مکان جس کے کرائے سب الگ الگ دیا کرتے تھے۔ کمروں میں ضرورت کا فرنیچر تھا۔ صحن انہیں مفت میں ملا ہوا تھا اور صحن کے ایک گوشے میں جو آم اور لوکاٹ کے پیڑ تھے۔ ان کے پھل بھی وہی کھایا کرتے تھے۔ نانیوں نے ہم سب کے فرداً فرداً انٹرویو لیے تھے اور مکمل چھان بین کی تھی

۔ پھر ہمیں یہ گھر ملا تھا سب سے آخر میں عرفان کی سفارش پر مجیب آیا تھا اور مجیب بھی کافی شریف تھا۔

لیکن مجھے عرفان کی شرافت پر شبہ تھا۔ گھر میں نہیں لیکن گھر کے باہر اس کی مصروفیات کچھ اور ہی ہوا کرتی تھیں۔ کبھی کسی لڑکی کے ساتھ ہوٹل میں چائے پی رہا ہے تو کبھی کسی لڑکی کے ہمراہ آئس کریم کھا رہا ہے۔ اس کے قول کے مطابق تو وہ لڑکیاں اس کی کزن ہوا کرتی تھیں بقول خود اس کے وہ اپنی کزنز میں بہت مقبول تھا۔ ہمیں حیرت ہوتی تھی کہ اتنے عزیزوں کے ہوتے ہوئے وہ کرائے کے کمرے میں کیوں رہ رہا ہے۔ اگر کوئی عزیز اس شہر میں تھا بھی تو اس سے ملنے کوئی نہیں آتا تھا۔ جب کہ میرے رشتے دار، زنگی اور تازی کے عزیز اکثر آتے تھے۔ اتنا عرصہ ساتھ رہتے ہوئے ہمیں ایک دوسرے کے مزاج سے بخوبی آگہی ہو گئی تھی اور ہم نے ایک دوسرے پر اعتبار بھی کر لیا تھا۔ تازی سے میری پرانی دوستی تھی۔ البتہ زنگی یہیں آ کر ملا تھا۔ دونوں بہت اچھے دوست ثابت ہوئے۔

زنگی لاپروا اور ہر طرح کے حالات میں گزر کرنے والا تھا۔ وہ بے حس نہ تھا۔ ہمدرد انسان تھا۔ گو کہ نانی کالونی میں بے شمار لوگ رہتے تھے مگر پھر بھی اکثر وہ نانی اشرفی کے کام کر دیا کرتا تھا۔ ہم لوگ تو صرف کرایہ دینے ان کے گھر جاتے تھے، مگر وہ نانی کی خیریت دریافت کرنے یا کوئی خبر سنانے ان کے گھر جایا کرتا۔ مثلاً یہ کہ نانی گھی مہنگا ہونے والا ہے۔ دو چار ڈبے گھی منگوا کر رکھ لیں۔ یا یہ کہ "حکومت نے بوڑھوں کے لیے ایک پارک بنانے کا اعلان کیا ہے۔ اس میں ایک کلب بھی ہو گا۔ نانی آپ اور باقی تمام گھر والے اس میں نام لکھوا کر ممبر بن جائیں۔ ممبر بننے کے بعد پارک کی سیر مفت ہو گی۔ پارک میں بوڑھوں کے مطلب کے کئی گیمز ہیں۔ جھولے اور سی سا بھی ہیں اور جھیل میں بوٹنگ کا انتظام بھی ہو گا۔" یہ پارک زنگی کے ذہن کی پیداوار تھا۔

"نانی..... لوگ" وہ ہنس ہنس کر بتا رہا تھا۔ "پارک بہت دلچسپی لے رہی تھیں۔ سچ! میں نے ایک وقت میں اتنے بہت سے پوپلے چہرے کبھی نہیں دیکھے جن کی آنکھیں شوق اور جستجو میں چمک رہی تھیں اور یہ چمک اتنی زیادہ تھی کہ ان کی عینکیں دھندلا گئیں۔ کئیوں نے تو عینکیں اتار کر صاف کیں۔ وہ حکومت کی تعریف کر رہی تھیں جس کو ان کی صحت کی فکر تھی۔"

"بوڑھوں کا ذکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ اتنے دن میں کوئی کامیابی بھی ہوئی۔ کوئی جوان چہرہ بھی نظر آیا۔" تازی نے پوچھ لیا۔ ہم تازی کے کمرے میں لائٹ بند کیے بیٹھے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔

"خدا کے لیے یار! زبان کو روکو۔ اگر آواز نانی کے کمرے تک پہنچ گئی، تو مارشل لاء لگ جائے گا۔ پہلے ہی ہم اندھیروں کی زد میں ہیں۔ تم ہتھکڑی لگوانے کی کوشش تو نہ کرو۔"

"تم موضوع سے ہٹنے کی کوشش نہ کرو۔ [illegible] مقصد کے لیے نانی کے دربار میں حاضری دیتے ہو۔ اس میں کتنی کامیابی ہوئی۔"

امتیاز عرف تازی باز آنے والوں میں نہ تھا۔ نورالدین جھینپ رہے تھے، صاف ظاہر تھا کہ دال میں کالا ہے۔

"کوئی نہیں، میں تو ان بے چاری بوڑھیوں کی دلچسپی کے لیے جاتا ہوں۔ میری نیکی کو یوں رسوا نہ کرو یارو۔" وہ سنبھل گیا۔

"ارے اس بے چارے کو کون گھاس ڈالے گا۔" عفی نے ہمدرد لہجے میں کہا۔ "ان کے اپنے خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک گبھرو جوان موجود ہے۔"

"گھاس تو گھوڑے کو کون ڈالتا چارہ ڈالا جا سکتا تھا۔ مگر اس کی ایک شرط تھی۔ وہ یہ کہ حضرت سال میں ایک دفعہ نہا دھو لیتے تو شاید کسی کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتے۔" مجیب نے پتے کی بات کی تھی۔ نورالدین رنگ کے اعتبار سے میلے تھے۔ لیکن مہینوں پانی نہ ڈالتے۔ ان کے قریب سے بھیڑ بکری کے [illegible] جیسی بو آتی تھی اور کسی لڑکی کا تو پتا نہیں، جب قریب سے گزرتے تو فرو ناک پر کپڑا رکھ لیتی یعنی سونے پر سہاگہ۔ لیکن بہرحال ان میں کئی خوبیاں ایسی تھیں جو ہم میں سے کسی میں نہ تھیں۔ یعنی ہمدردی، مروت کا جذبہ، پردہ پوشی۔ وہ کبھی کسی کی برائی نہ کرتے اور کسی میں عیب نہ نکالتے۔

♥ ♡ ♡ ♥

فرو شادی کی سالگرہ کرنا چاہتی تھی۔ مجیب کو سالگرہ منظور تھی۔ مگر وہ فرو کے ہاتھوں اپنی کمائی کی بربادی کے خلاف تھا۔ اس لیے پارٹی میں بازار کی چیزوں کی فہرست بنا دی۔ فرو نے رقم کے ضیاع سے بچنے کے لیے گلناز کا نام پیش کر دیا کہ وہ آ کر کئی چیزیں بنا دے گی اور میں اس سے سیکھ بھی لوں گی۔ گلناز کو بلا دیا گیا۔ تو ساتھ ہی اس کے دو دیور اور ایک نند کو بھی بلایا گیا۔ با حضوری..... پھر بختیار کے ساتھ اس کی بھابی اور بہن کو بھی بلانا پڑا۔ گلناز صبح سے ہی آ گئی۔

دفتر سے آ کر سب حسب معمول آرام کرنے لگے۔ ایک ایک نیند لے کر اٹھے تو معلوم ہوا کہ پارٹی کا سب انتظام ہو چکا۔ صحن میں پانی ڈال کر خوب دھلائی کی گئی تھی اور میزیں لگا دی گئی تھیں۔

"یارو!" مجی نے بسور کر ہم سب سے کہا۔ "میں تو صبح سے کام میں جتا ہوا ہوں۔ ذرا میری مدد تو کرو۔ یہ صحن دھو دھو کر میری کمر دوہری ہو گئی ہے۔ بھاری بھاری میزیں اٹھا اٹھا کر ہاتھ شل ہو گئے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں تمہاری ہی شادی کی سالگرہ ہے۔" تازی نے لاپروائی سے کہا۔ وہ ابھی تک نیلی شلوار اور خاکی قمیض میں ملبوس تھا۔

"زنگی میاں کدھر ہیں؟! انہیں کام سے لگاؤ۔" عفی نے کہا۔

"یار! اسے تو بمشکل تمام میں نے پکڑ دھکڑ کر باتھ روم میں دھکیلا ہے۔ وہ نہا لے، یہی اس کا بڑا احسان ہو گا۔"

فرو ہاتھ میں کوئی ڈش لیے آئی۔ میز پر ڈش رکھتے

ہوئے اس نے تازی سے کہا۔ "خدا کے لیے تازی بھائی کپڑے تو بدل لیں۔ مہمان آنے ہی والے ہوں گے۔"

"کپڑے ... مہمان۔" تازی نے حیرت زدہ ہو کر اپنے لباس پر نظر ڈالی۔ "کیا مطلب مہمان میرے کپڑے دیکھنے آئیں گے۔"

"پھر بھی کم از کم ایک رنگ کا سوٹ ہی پہن لیں یا پھر پینٹ شرٹ صبح والی حلیہ تو درست کر لیں۔"

"بھئی! پینٹ شرٹ تو آفس کا لباس ہے اور اگر تمہارے مہمان میری شلوار قمیص دیکھ کر بھاگ جائیں تو اس میں میرا کیا قصور۔" زنگی نہا کر نکلا تو سب نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔

اس کا رنگ خوب چمک گیا تھا۔ جیسے پالش کی گئی ہو۔ تازی پارٹی میں اسی لباس میں موجود رہا۔

عفی نے ٹرانسسٹر کانوں سے لگا رکھا تھا۔ وہ کرکٹ میچ کی کمنٹری سن رہا تھا۔ جو کسی دور دراز کے ملک میں ہو رہا تھا۔ فرو کو بہت افسوس تھا۔ نانی کالونی عرف ساسوں کی چھاؤنی کے مہمانوں کے سوا کسی نے اس کی اس بے حد اہم پارٹی کو اہم نہ سمجھا۔ بے چاری گلناز تو اس قدر تھک گئی تھی کہ اس سے کچھ کھایا بھی نہیں گیا اور مجی اتنا مضمحل تھا کہ تقریب کے دولھا والی بات پیدا نہ کر سکا۔ صرف فرو ہی کامدار ساڑی میں چمکتی رہی اور سریلے قہقہوں کے ساتھ چہکتی رہی۔

پارٹی کے بعد اس نے سب کو شرمندہ کیا کہ ہم نے دوستی کے تقاضے کو پورا نہیں کیا۔ کم از کم ہم ایک پھول تو اس کی نذر کر ہی سکتے تھے نہ سہی قیمتی تحفہ۔ زنگی ہکلا ہکلا کر قسمیں کھا رہا تھا کہ اس کا تو پکا پروگرام تھا تحفہ لانے کا مگر مجیب نے اسے باتھ روم میں دھکیل دیا۔ تو چھ مہینے کا میل ایک آدھ گھنٹے میں تو اترنے سے رہا۔ سارا وقت وہ جسم کی بتیاں مل مل کر بہاتا رہا۔

ہم نے فرو کو مایوس کر دیا تھا۔ اس کی مایوسی کو شادمانی میں بدلنے کے لیے ہم الگ الگ تحفے لائے جو دوسرے دن اس کو دیے گئے۔ عفی نے یقین سے کہا کہ "اس کو علم ہے شادی کل کے دن نہیں بلکہ آج کے دن ہوئی تھی۔"

"میرے پاس ابھی کارڈ موجود ہیں دیکھ لیجیے گا۔" تحفے لے کر زیادہ خوش نہیں تھی کہ نانی کالونی کے کسی مہمان نے نہیں دیکھے۔

"تم بھول گئی ہو۔ کارڈ میں یقیناً" کل کی تاریخ تھی۔ لیکن اس رات ٹی وی پر ایک لانگ پلے آ رہا تھا۔ اس لیے سارے باراتی اسے دیکھنے پر مصر رہے۔ بارات آدھی رات کو تمہارے گھر پہنچی تھی۔ پھر قاضی صاحب انتظار سے تنگ آ کر کہیں غائب ہو گئے۔ انہیں تلاش کر کے خوشامدوں سے لایا گیا تھا۔ جب نکاح ہوا تو اگلی تاریخ شروع ہو گئی تھی۔"

عفی تفصیل بتا رہا تھا۔ مجی تائید میں سر ہلا رہا تھا۔

"چلیے، مان لیا مگر پھر بھی آپ لوگوں نے میری خوشی کو اہمیت نہیں دی۔ آپ مستقل ٹرانسسٹر کانوں میں چپکائے رہے۔ زنگی صاحب نے نہانے میں چھ گھنٹے لگا دیے اور تازی بھائی نے تو لباس تبدیل کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی اور انصار بھائی ذرا معقولیت کے جامے میں تھے تو وہ [illegible] رہے تھے نہ گلناز نے دیوروں سے کسی کی بات کی نہ کسی اور سے۔"

فرو کا منہ پھولا ہی رہا۔

اگلے دن گلناز اپنے دیوروں کو لے کر آئی۔ اس کے کافی برتن فرو نے منگائے تھے۔ وہ دیوروں کو برتن اٹھانے کے لیے لائی تھی۔ تو ہم سب نے اس کے دیوروں کو گھیر لیا اور خوب باتیں کیں۔ وہ بے چارے ہونق سے بنے رہے۔ ہم ان کے ہاتھ تھام کر اپنی طرف متوجہ کرتے اور مصنوعی ہنسی ہنس کر باتیں کرتے۔ پھر بھی فرو کا مزاج درست نہ ہوا۔ اس نے ان لوگوں کے جانے کے بعد پیر پٹخ کر کہا۔

"بعد از مرگ واویلا۔"

اور کمرے میں چلی گئی۔ مجیب نے صحن کو اس قدر رگڑ رگڑ کر دھویا تھا کہ لگتا ہی نہ تھا یہ وہی صحن ہے۔ دھول میں اٹا ہوا۔ چنانچہ تین چار راتیں ہم صحن میں گیمز کھیلتے رہے۔

اس رات مچھروں نے یلغار کی تو کمروں کا رخ کیا۔ مجی کسی طرح اپنا کمرہ ہم میں سے کسی سے شیئر کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ چونکہ وہ شادی شدہ ہے اس لیے اسے پرائیویسی کی زیادہ ضرورت ہے۔ کمروں کے سب کمرے ایک لائن میں بنے ہیں۔ دیوار سے کان لگاؤ تو ساتھ کے کمرے کی باتیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ ایسا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ تازی بڑبڑاتا رہا۔

"شادی کر کے انوکھا ہو گیا ہے۔ ہم بھی کر سکتے ہیں کوئی کمال نہیں ہے۔ اس سے پوچھو کیا یہ [illegible] سازشیں کیا کرتا ہے جس کے سن لینے کا اس کو خطرہ ہے۔ شادی کر کے کوئی اس طرح خود غرض ہو جایا کرے۔ تو لوگ شادی کا نام لینا چھوڑ دیں گے۔ میری توبہ ایسی شادی سے۔"

مجی ڈھیٹ بنا ہنستا رہا۔ عفی نے بھی کہا۔ "مجی یار! ہماری بے لطفی کا کچھ خیال نہیں۔ اندھیرے میں بوریت کا ماتم کرتے ہیں۔ اچھا ہے کر کے اپنے کمرے میں ہی ہمیں بازی لگانے دو۔"

مجی آنا کانی کرنے لگا کہ فرو جلد سو جاتی ہے۔ اس کی نیند میں خلل ہو گا وغیرہ..... حالانکہ فرو ہمارے ساتھ شریک ہوتی تھی اور چاہتی تھی تو بارہ ایک بجے تک بھی جاگتی اور قہقہے لگاتی تھی۔

ہماری زندگی اب گھٹنے لگی تھی۔ نہ ساڑھے آٹھ بجے کھیل جمتا، نہ محفل سجتی نہ شور شرابا ہوتا۔ بس چھٹی والا دن ہی عید کا دن ہوتا۔ کبھی کبھی فرو اور مجیب کی لڑائی ہو جاتی تو سب کی دلچسپی کا سامان ہو جاتا۔ ہم باری باری انہیں سمجھاتے۔ فرو سامان سمیٹنے لگتی جانے کے لیے اور ہم اس کے ہاتھ سے چھین کر الماریوں میں رکھتے جاتے۔ مجھے نہیں یاد کہ ہماری خوشامدوں، التجاؤں اور نصیحتوں کے نتیجے میں کبھی ان کی صلح ہوئی ہو۔ وہ نہ نہ کرتے رہتے، مجی بنا دانت کریدتا رہتا۔ ہم تھک جاتے۔ پھر پتا نہیں کس طرح چپکے سے ان کی خود ہی صلح ہو جاتی اور ان کے سریلے قہقہے جاگ اٹھتے۔

اب نانی کے آرڈر کے بعد ہم جتنی دیر صحن میں بیٹھ سکتے، کھیل کھیلتے، لڑتے پھر کمرے میں آ کر گپیں مارتے اور سو جاتے۔ بے رونق زندگی۔

عفی نے تو پر پرزے نکال لیے تھے۔ وہ شام کو نہا دھو کر کہیں چلا جاتا۔ رات کو آتا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی۔ تازی اور زنگی پوچھ پوچھ کر تھک جاتے، وہ نہ بتاتا کہ کہاں گیا تھا۔

ان ہی دنوں جب ہم بوریت کی انتہا کو پہنچ چکے تھے اور زنگی کے مشورے پر نانی سے درخواست کرنے والے تھے کہ وہ اپنا کمرہ تبدیل کر لیں۔ اندر کے کسی کمرے میں شفٹ ہو جائیں۔ جہاں ہماری کھڑکی سے بلب کی روشنی اندر نہ جا سکے اور ان کی نیند خراب نہ ہو۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ ہماری خزاں رسید زندگی میں بہار کا ایک جھونکا مہکار لے کر آ گیا۔

یہ جھونکا جس کا نام وردہ تھا مجیب کی کزن تھی مجیب اسے لے آیا تھا۔ دراصل وردہ کو ہمارے شہر کے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ اب وہ کسی رہائش کی تلاش میں تھی۔ کیونکہ ان کا کوئی عزیز سوائے مجیب کے اس شہر میں نہ تھا۔ مجیب نے کہا۔ "جب تک ہوسٹل میں جگہ ملے تم ہمارے پاس ہی رہ جاؤ۔ فرو کی تنہائی رفع ہو۔" چنانچہ جتنے دن وہ رہی، مجی میرے کمرے میں رات بسر کرنے آ جاتا۔

وردہ سادہ اور کھری لڑکی تھی۔ نہ کسی سے فری ہوتی تھی، نہ ہی بلا ضرورت تکلف کرتی تھی۔ وہ فرو کے پاس ہی رہتی تھی۔ مگر شام کو صحن میں وہ خوب پانی بھر دیتی اور کرسیاں لا کر رکھ دیتی۔ فرو اور وہ وہاں بیٹھ کر گپیں ہانکتیں تو ہم بھی اپنی اپنی کرسی لے کر جا بیٹھتے۔

سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ وردہ نے آتے ہی کچن کا چارج فرو سے لے لیا اور مزے مزے کے کھانے پکانے لگی۔ فرو سکون کا سانس لے کر شکریہ ادا کرتی رہتی۔ سب سے زیادہ خوشی اسے ہی ہوئی تھی۔

خوش تو ہم بھی کم نہ تھے۔ اب رات کو ساڑھے آٹھ بجے محفل جمانے کی نوبت ہی نہ آتی۔ صحن میں

بیٹھے خوش گپیاں کرتے۔ ٹھنڈی زمین ٹھنڈا آسمان، فرو کے قہقہے، وردہ کی میٹھی نرم آواز، ٹھنڈا ٹھنڈا سا لہجہ اور مجیب کے لطیفے۔ ہزار بار کے سنے ہوئے پرانے لطیفوں پر بھی ہم دل کھول کر ہنستے۔ زندگی کا انداز بدل سا گیا تھا۔ عفی نے ٹرانسسٹر کسی کونے میں پھینک دیا تھا۔ تازی خوش مزاج ہو گیا تھا۔ اور زنگی میاں نے تو پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ وہ ہر تیسرے دن باتھ روم میں پائے جانے لگے۔

رہا میں، تو میری ازلی اداسی بھی کہیں کسی گوشے میں جا چھپی تھی لیکن میں اپنے تاثرات چھپانے میں ماہر تھا۔ یوں بھی مجھے جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینے کی عادت پڑ گئی تھی۔

تعجب کی بات تو یہ تھی اب سے پہلے، جب فرو ہمارے درمیان آئی ہمارے معمولات میں کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ حالانکہ وہ بھی لڑکی ہی تھی۔ لیکن اس میں اور وردہ میں فرق تھا۔ فرو شادی شدہ تھی، دسترس سے دور اور خامیوں سے پُر۔

وردہ میں اور فرو میں بہت فرق تھا۔

اس دن جب فرو نانی کالونی عرف ساسوں کی چھاؤنی کے مکینوں خصوصاً "نانیوں کی نقل کر رہی تھی، پوپلا منہ بنا کر بول رہی تھی اور کمر جھکا کر رعشہ زدہ ہاتھوں اور گردن کا مظاہرہ کر کے ان کی چال کی نقل کر رہی تھی تو گو کہ عفی اور زنگی اس کی حرکتوں پر ہنس رہے تھے اور تازی بھی ایک بار مسکرا دیا تھا۔ میں قدرے سنجیدہ، افسوس کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا تو میں نے وردہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ خوش نہیں تھی۔ مسکرائی تک نہیں بلکہ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے منڈلانے لگے تھے۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں بھابی! نہیں، ایسا مت کرو بری بات ہے۔"

"بھئی! بری بات کیا ہے؟ میں ان کا مذاق تو نہیں اڑا رہی، صرف نقل کر رہی ہوں اور وہ بھی اس لیے کہ مجھے ان سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ میری کزن ان کی بہو ہے۔ کسی کی نواسی بہو، کسی کی پوت بہو تو کسی کی بھتیجی بہو۔ ارے اتنی ساسیں ہیں اس گھر میں کہ شمار ممکن ہی نہیں۔ بہوئیں بے چاری تو تنگ آ لگتا ہے ساری بڑھیاں قیامت کے گی۔"

"خدا کے لیے بھابی! اس طرح مت بے چین ہو کر بولی۔ "پتا نہیں وہ خود اس عاجز ہوں گی۔"

اس کے لہجے میں بڑا دکھ تھا۔ میں حیران دیکھنے لگا۔ وردہ ان سے ملے بغیر ہی ان رہی تھی۔ اس میں احساسِ درد تھا۔ وہ ا لیے سے واقف تھی۔ شاید اسے بھی کوئی سوچتا رہا۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہ بیٹھی، اٹھ کر لگتا تھا رونے والی ہے۔ ممکن ہے کمرے میں روئی بھی ہو۔

پہلی بار مجھے کوئی لڑکی اچھی لگی۔ انسا سے۔ میرے دل پر جیسے کسی نے شبنم چھڑ ہوا حرکت کرتا ہوا وہ لوتھڑا پہلی بار کسی احساس آسودہ ہوا تھا۔ وردہ کے جاتے ہی سب خاموش اور فضا سوگوار ہو گئی۔ فرو کھسیانی ہو کر میں مصروف ہو گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

موسم بدل رہا تھا۔ طبیعتیں بحال تھیں خوشگوار۔ مجیب کی کوشش تھی کہ وردہ بھی اسی رہنے لگے مگر اول تو کوئی کمرہ اب خالی نہیں برآمدے کو بند کر کے کمرے کی شکل دینے کی نانیوں نے منظور نہ کی۔ وردہ نے خود بھی رہنے نہ کیا۔

"نہیں مجی بھائی! میں یہاں رہ کر لوگوں کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتی۔" اس نے کہا۔

"یہ تم کہہ رہی ہو وردہ! تمہیں تو لوگوں کی پروا تھی۔"

"اس وقت میری پشت پناہی کے لیے چچا جان تھے۔" اس نے کہا۔

"اب ہم زندہ ہیں۔" فرو نے کہا۔

"نہیں بھابی! بس میں غیروں کا احسان لے سکتی

رشتے داروں نے مجھے اس قابل کسی پر بھروسا کر سکوں۔ میں نہیں ساتھ آپ پر بھی انگلیاں اٹھائی

گی۔ "میری محبت اور چاہت کا یہ صلہ

لانے لگی۔ وہ ایک ہوسٹل میں کوشش اس کو روک رہے تھے۔ اب وہ جا رہی تھی اور دوپہر کو تھکی ہاری آتی

دو دن کی چھٹی لے کر گھر پر ہی نے وردہ کو دیکھا۔ اسکول سے بس میں اور گھر آتے ہی فرو اسے کام سے لگا دیتی دھو کر وردہ پیشانی پر شکن لائے بغیر کھانا بس کے انتظار کی کوفت اور بس کے شروع کرتی تو فرو اپنی مصروفیت اور بیٹھتی۔

ہی زیادہ کام مجیب سے لیتی تھی اور دن بھر کرتی۔ میں اپنے برآمدے میں لیٹا اس کو صبح سے ہی گلناز کے بچے کو بلا لیتی تھی کی وجہ سے جو اس کے پیر دباتا رہتا۔ ایک ٹانگ دے کر وہ ننھی سی جان سے چھوٹے موٹے کام کرا لیتی۔

کو آ جاتی۔ پھر کمرہ بند کر کے دونوں خوب قہقہے لگاتیں۔ یقیناً" وہ نانیوں کی نقلیں ہوں گی۔ میں تیز بخار میں پڑا تھا۔ فرو ایک بار آ یت کا ضرور پوچھ لیتی تھی۔ لیکن اس نے ایک مجھے چائے کا نہیں پوچھا۔ البتہ وردہ آتے ہی دوا کے بارے میں سوال کرتی۔ پانی لا کر رکھ دیتی چائے بھی بنا کر لے آتی، اصرار سے بسکٹ کھلاتی۔ لڑکی میں ہمدردی اور خدمت کا جذبہ بے حساب ہوا تھا۔

دو دن کے بخار میں تنہائی اور بے بسی کے احساس مجھے بیماری سے خوفزدہ کر دیا تھا۔ غریب الوطنی اور بے بسی کے عالم میں وردہ نے ایک رحمت کے فرشتے کی طرح میری دیکھ بھال کی۔ وہ میری کوئی نہیں تھی۔ مگر دو دن میں ہی میرے بہت قریب آ گئی۔ اس کے حالات بھی مجھ سے ملتے تھے۔ لیکن وہ لڑکی تھی۔ سخت مصائب میں گھری ہوئی کمزور اور اکیلی۔ میں بہرحال اس سے بہتر پوزیشن میں تھا ہمدردی سے میرا دل بھر گیا۔ جی چاہتا تھا اس کی مدد کروں۔ زبانی ہمدردی سے فائدہ نہ تھا البتہ دلجوئی کرنے میں کسر نہ چھوڑی۔

ذرا سے تسلی کے لفظ سن کر ہی اس کی پلکیں بھیگ گئیں اور وہ دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی۔ بعد میں وہ پھر منہ ہاتھ دھو کر آئی اور چپکے سے بولی۔

"اپنوں نے اتنے دکھ دیے ہیں کہ کسی کی زبانی ہمدردی کی امید ہی نہیں رہی۔ اب عادت ہی نہیں رہی۔"

فرو کمرہ بند کیے آرام کر رہی تھی۔ وردہ اپنی بے بسی اور غم کی داستان مجھے سناتی رہی۔ اس کے والدین اس کی کم سنی میں انتقال کر گئے تھے۔ چچا نے بہت محبت اور پیار سے پرورش کی۔ اس کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ رشتے دار اور خاندان والے ہی نہیں چچی اماں بھی ان سے کہتی تھیں کہ "لڑکی ذات کو اگلے گھر جانا ہے۔ اس کا دماغ اتنا خراب نہ کرو کہ وہ عرش پر پہنچ جائے۔"

وردہ چچا کی محبت کے حصار میں جوان ہوئی۔ وہ بہت حاضر جواب اور خوش گفتار تھی۔ ہر خوش نما چیز کی فرمائش کر بیٹھتی۔ چچا نے کبھی اسے مایوس نہیں کیا۔ لوگوں میں وہ فضول خرچ، بے ڈھنگی، ناعاقبت اندیش مشہور ہو گئی۔ خاندان میں ہی ایک لڑکے سے اس کی منگنی ہوئی تھی۔ اسی بنا پر وہ ٹوٹ گئی۔ سب اسے خر دماغ، عرش مکیں اور گستاخ کہنے لگے۔ اسے کسی کی پروا نہ تھی۔ وہ سب کو ٹکا سا جواب دینے کی عادی ہو گئی۔

اور پھر چچا بھی نہ رہے۔ چچی اماں اور ان کی بہو نے اسے اپنا انتظام کرنے کا نوٹس دے دیا۔ وہ کیا کرتی،

کہاں جاتی، حواس باختہ ہو گئی۔ خاندان میں کوئی اس کا ہمدرد نہ تھا۔ اسے طنز کے تیروں سے چھلنی کر دیا گیا۔ بہتان تراشی کی گئی۔ کسی نے اس کے سر پر ہاتھ نہ رکھا۔

چچا کا ایک پرانا ملازم اسے اپنے گھر لے گیا۔ وہ ایک نادار کنبہ تھا۔ مگر اسے وہاں تحفظ ملا۔ جب ان کے گھر کھانا ہوتا، سب مل کر کھاتے، جب فاقہ ہوتا سب کے ساتھ وہ بھی فاقہ کر لیتی۔ انہی ملازم جنہیں وہ بابا کہتی تھی، کے گھر رہ کر اس نے بی اے کا امتحان دیا۔ بی ایڈ کیا۔

خاندان کے لوگ اس پر کیچڑ اچھالتے رہے، اسے حقیر سمجھنے لگے۔ مگر کسی کے خون میں جوش نہ آیا۔ وہ بابا کے گھر رہتی رہی۔ بالآخر اس کے صبر کا صلہ مل گیا۔ اور اس کو اسکول میں سروس مل گئی۔

مجیب ہمیشہ اس کا ہمدرد رہا تھا۔ مگر باقی رشتے داروں کے ڈر سے اس کی مدد نہ کر سکتا تھا۔ وہ اتفاق سے اس کو شہر میں گھومتی ہوئی ملی تھی۔ ہوسٹل کی تلاش، داخلے کا انتظام، کوشش اور جدوجہد۔ سب سن کر وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

میں اس کی داستان سن کر ٹھنڈے پسینوں میں نہا گیا تھا۔ میرا بخار اتر گیا۔ میں نے وردہ سے وعدہ کیا کہ جب بھی اسے کسی ہمدرد، کسی سہارے کی ضرورت ہو، مجھ سے رابطہ قائم کر لے۔ میں ہر قسم کی مدد کروں گا۔

وردہ میں قوتِ برداشت تھی۔ وہ مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی۔ مجھے ایسی لڑکیاں پسند تھیں۔ جو دکھوں کی آگ میں تپ کر اپنی آب نہ کھوئیں۔ مزید جلا پائیں۔ یقیناً وردہ میری آئیڈیل تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

وردہ کو ہوسٹل میں جگہ مل گئی۔ وہ چلی گئی۔ مگر ہر ہفتے آتی تھی۔ خوب مزے مزے کے کھانے پکاتی تھی۔ سب کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی اور پھر چھٹی کا دن گزار کر چلی جاتی۔ وہ آتی تو بہار بن کر سب کے اعصاب پر چھا جاتی۔ تازی ہر رنگ لباس پہننے لگتا۔ بن ہنسے مسکرانے لگتا۔ عفی جو اپنی نام نہاد کزنز پر پیسہ لٹاتا تھا اور اپنی کنجوسی کو کفایت کا نام دیتا تھا۔ اپنا

پر اتر آتا۔ جیب سے نوٹ نکال کر زنگی کو

مذاقاً" کہتا۔

"چل میرے گھوڑے سرپٹ چل" آئس

کر آ اور ذرا جلدی۔"

"ڈنگی چال سے واپس آنا۔" فرو ہنس کر

اس نیک کام کے لیے فوراً" چل پڑتے۔

آئس کریم کھاتے۔ فرو کے قہقہے، مجیب

ساتھ ساتھ چلتے۔

"اپنی تو قسمت ہی خراب ہے۔" ایک

نے بسور کر مجھ سے کہا۔ "ایک لڑکی

بنانے میں دلچسپی لیتی ہے۔ ہٹ تیری۔"

"یہ کس لڑکی کا ذکر ہے؟"

"وردہ اور کون؟ کیا اس نے تم کو بھائی نہیں

"موقعہ نہیں ملا ہوگا۔" زنگی تیزی سے بولا۔

تو یہ دردناک سانحہ کب پیش آیا؟ اور تم نے اس طرح مقابلہ کیا؟"

"مردانہ وار۔" تازی فخر سے بولا۔

نہیں ہیں کوئی ہم سے جان طلب کرے تو ہم الفور دے ڈالیں گے۔ یار انصار! تم سے بھائی نہیں جوڑا اس نے؟"

"نہیں، شاید اسے میرا چوکھٹا پسند نہیں آیا۔"

سنجیدہ ہو گیا۔

"یا پھر دال میں کالا کالا۔" زنگی نے خیال

"جہاں تک میں نے اسے جانا ہے۔" تازی سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ نہ خود شک میں مبتلا ہوتی دوسرے کو شبہ میں گرفتار رکھتی ہے۔ اسے جب پسند آئے گا وہ سادگی سے کہہ دے گی۔ تم ہی آئیڈیل ہو۔"

"ہمارے معاشرے میں بڑی عجیب عجیب رواج پا گئی ہیں۔ لڑکا جب چاہے کسی بھی لڑکی رکھ دیتا ہے کہ یہ مجھے پسند ہے مگر لڑکی سے شادی وقت بھی رائے نہیں لی جاتی کہ تجھے کیا پسند ہے۔ مگر وردہ وہ روایتی لڑکی نہیں ہے۔ جو مرد کی پسند

ظہار کرے۔"

"ہاں! یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔" ازی نے کہا۔

♥ ♡ ♡ ♥

نانی الفتی بیمار تھیں۔ زنگی ان کی خیریت کو جانے لگا تو میں بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ وہ بستر پر لیٹی تھیں۔ بہت ضعیف ہو گئی تھیں مگر اب تک ان کی ہمت جوان تھی۔ خود ہی دوا پیتی تھیں، خود ہی اٹھ کر چائے بنا لیتی تھیں۔

نانی کی کالونی میں بے شمار لوگ موجود تھے۔ ہر جگہ انسان تھے مگر سب کی اپنی اپنی مصروفیت تھی۔ کسی کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی اور کئی خواتین کپڑوں کی سلائی میں مصروف تھیں۔ کسی کے امتحان نزدیک تھے تو وہ اپنے کمرے میں زور زور سے پڑھ رہا تھا۔ سامنے والے کمرے میں دو لڑکیاں پائپ لیے کمرہ دھونے میں مصروف تھیں۔

بے چاری نانی الفتی اکیلی پڑی تھیں۔ ان کی اولاد میں سے بیٹا تو کب کا فوت ہو گیا تھا۔ پوتے، نواسے، نواسیاں تھے۔ کوئی ان کے ساتھ، کوئی کہیں، کوئی کہیں۔ مجھے نانی الفتی کی بے چارگی پر دکھ ہو رہا تھا۔ مگر وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔

جب میں نے فرو کو بتایا تو وہ چپ ہو گئی۔ وردہ بے چین ہو گئی اور اگلے دن جب میں اور زنگی، نانی الفتی کے پاس پہنچے تو وہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس کے کئی دن بعد پھر میرا جانا ہوا، وردہ وہیں ملی۔ شاید اسکول سے آ کر وہ نانی کے پاس آ جاتی تھی۔

نانی بہت ممنون تھیں۔ بار بار وردہ کی خدمت گزاری کا ذکر کر کے آبدیدہ ہو جاتی تھیں۔ اس نے فرو سے شکایت کی کہ کیا ہم مر گئے ہیں جو نانی کی خدمت کے لیے غیروں کا احسان لینا پڑا۔

لوگوں کا احساسِ ذمہ داری مردہ ہو گیا تھا مگر انا زندہ تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

سردیوں کی آمد کے ساتھ مزاج میں خنکی سرایت کر رہی تھی۔ مجیب اور فرو میں سرد جنگ شروع ہو گئی۔ پہلے فرو اپنا سامان پیک کرنے لگتی تھی۔ مگر یہ عجیب لڑائی تھی کہ وہ جانے کے بجائے کام میں مصروف رہنے لگی۔ وردہ آتی بھی تو اسے کچھ کرنے نہ دیتی اور منہ پھلائے ادھر سے ادھر کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی۔ وہ وردہ سے مخاطب بھی نہ ہوتی۔ مجیب ہی اس سے باتیں کرتا۔ پھر وردہ نے چھٹی کے دن آنا چھوڑ دیا۔ ایک روز وہ آئی تو رنجیدہ تھی۔ فرو، گلناز کے پاس گئی ہوئی تھی وردہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ نے سنا بھابی نے کیا شوشا چھوڑا ہے؟"

"نہیں، کیوں کیا ہوا؟"

"وہ میری شادی عفی سے کرنا چاہتی ہیں۔"

میں اسے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ پر امید نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"ان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ وہ اس کا بدلہ چاہتی ہیں۔"

"مجیب کیا کہتا ہے؟" میں سناٹے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وہ..... انہی کی وجہ سے بھابی کو میرا مجیب بھائی سے ملنا پسند نہیں۔ مجیب بھائی بہت مہربان ہیں مجھ پر انہیں گوارا نہیں۔"

"اب..... اتنا عرصہ گزرنے کے بعد..... کیا فرو سو رہی تھیں اب تک؟"

میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ میں کوشش کے باوجود پوچھ نہ سکا "اس کا کیا خیال ہے۔"

"احسان کا بدلہ کسی طرح بھی اتارنا ہوگا مجھے۔" وہ اچانک وہاں سے ہٹ گئی۔

زنگی نے خبر دی کہ آج کل فرو، عفی سے بہت فری ہو رہی ہے اور اس کی شادی کی کوشش کر رہی ہے۔ جبکہ مجیب اس پر خفا ہوتا ہے۔ دونوں میں لڑائی کی وجہ وردہ ہے۔ جس کے کھانوں کی، چائے کی، ہر کام کی مجیب تعریف کرتا ہے اور فرو کو شرم دلاتا ہے۔

اب عفی کو دولہا بنانے کی تیاری ہو رہی ہے اور

مجیب نے عفی کی والدہ کو لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کا سہرا دیکھنا چاہتی ہیں تو آجائیں۔ اس بات پر فرو ناخوش ہے۔ وہ تو عفی کی خوشامد پر شادی کے لیے تیار ہوئی تھی اور عفی ہی کی خواہش پر رازداری سے شادی کرنے والی تھی۔ مجیب سے بری بنی اور عفی کی ماں بھی اسے ہرگز نہیں بخشیں گی۔ وہ ڈر رہی ہے۔

"وہ محض اداکارہ ہے۔ مجیب کو متاثر کرنے کے لیے ـــ خوفزدگی کا ڈھونگ رچا رہی ہے۔" تازی نے تبصرہ کیا۔

شام کو میں نانی کی طرف چلا گیا۔ انہوں نے بختیار کے ذریعے مجھے بلایا تھا۔ نانی اب بہتر تھیں۔ وردہ کی ممنون۔ جس نے ان کی خدمت کی تھی۔

"تم مجھے شریف لڑکے لگتے ہو۔" انہوں نے کہا۔ "اگر میں تمہیں ایک ثواب کمانے کا موقع دوں تو تم انکار تو نہیں کرو گے؟"

انہوں نے وضاحت کی کہ وہ وردہ سے ہمدردی کی بنا پر اس کو عفی سے بچانا چاہتی ہیں۔ عفی کی شہرت ٹھیک نہیں مگر فرو ضد پر آگئی ہے۔ اور وہ اس سے پہلے ہی کسی شریف آدمی کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دینا چاہتی ہیں۔ وہ بزرگ ہیں، تجربہ کار ہیں اور وردہ کی محبتوں، خدمتوں کے احسانات کے صلے میں اسے محفوظ اور نیک نام ہاتھوں میں دینا چاہتی ہیں۔

"میں اس کی رشتے دار نہ سہی مگر ان رشتے داروں سے بہتر طریقے پر سوچتی ہوں۔ اس کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ بے چاری یتیم بچی۔"

یتیم بچی کہہ کر وہ شاید میری ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ مجھے ہنسی آگئی۔

"ہنسنے کا موقع نہیں ہے۔ اگر تمہیں اس سے شادی منظور ہے تو بتاؤ۔ میں کل ہی یہ کام کرنا چاہتی ہوں ہر حال میں، ورنہ پھر میں زکی کو مجبور کروں گی۔ وہ بھی نیک لڑکا ہے۔ سب کے کام آتا ہے تو انکار کیسے کرے گا۔"

میں بے چین ہو گیا۔ زکی...... اوہ! نہیں...... قدرت مجھے موقع دے رہی تھی۔ میں اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ نانی کسی کی بھی نہ تھیں اور سب کی تھیں۔ خوشی اور اطمینان کیسا ہوتا ہے۔ یہ میں اس وقت جانا۔ اپنا آئیڈیل مل جانا بڑے نصیبوں کی بات ہے۔

مجھے اقرار کرتے وقت نہ اپنا گھر یاد آیا نہ ماضی، رشتے دار نہ خاندان، عفی اور فرو کیا کریں گے، کیا نہیں گے۔ مجھے کسی کی پروا نہ رہی۔ نانی عظمت کا مینار میرے سامنے تھیں۔ ان کا دل انسانیت کے درد سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی حوصلے والی تھیں نانی۔

وردہ آئی تو اسے خبر نہ تھی کہ نانی اور میرے درمیان کیا طے پا چکا ہے۔ سنجیدہ سی تھی۔ مجیب اور فرو کی خیریت دریافت کرنے لگی۔ اس نے وہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے وردہ کو ہنسانے کے لیے لطیفے کا سہارا لیا۔ وہ مزید سنجیدہ ہو گئی۔

"آپ کو معلوم ہے میری قسمت کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ کیا آپ میری مدد نہیں کر سکتے؟"

"کر سکتا ہوں، کروں گا۔ جب تم پکارو گی، سر کے بل دوڑتا آؤں گا۔"

"میں کوئی انہونی فرمائش نہیں کروں گی صرف [illegible] سی مدد۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ٹھنڈا یخ ہاتھ۔ "میں نے تم سے بہت پہلے کہا تھا تم جب بھی چاہو گی، میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔"

"بس ٹھیک ہے۔ یہ وعدہ کافی ہے۔" وہ سر ہلا کر بولی۔

"لیکن تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی، میں چاہتا ہوں کہ تم کو۔"

"نہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ آپ انسان ہیں اور یہ کافی ہے۔"

میں واپسی کے لیے باہر آ رہا تھا تو وہ میرے ساتھ تھی۔ گیلری میں کھڑے ہو کر ہم دیر تک باتیں کرتے رہے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

"نہیں، اب میں ٹھیک ہوں۔" اس نے

"صرف رشتے داروں، اپنوں کے لگائے زخموں سے چور ہو گئی ہوں۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ نہیں دیں گے، یہ یقین ہو گیا ہے مجھے۔"

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ بے حد پُر کشش نظر آ رہی تھی۔ میں نے ابھی تک اس کو آنے والے کے پروگرام کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں سوچ رہا تھا، کل اس کو جو مسرت حاصل ہو اس کو میں آنکھوں سے دیکھنا چاہوں گا۔ اس نیم تاریک گیلری میں شاید وہ خوشی کی کرنیں صحیح طور سے نہ دیکھ پاؤں اور بہتر ہے کہ وہ نانی سے میرے اقرار اور رضامندی کی بات سنے۔

وہ شام میری زندگی کی سب سے حسین شام تھی۔ وہ سانولی اور چمکتی دمکتی شام اور اگلا دن چکا چوند لائے گا۔ اس کا تصور ہی مجھے چندھیائے دے رہا تھا۔ زندگی کا خواب پورا ہونے والا تھا۔ میں رات ٹھیک سے سو بھی نہ سکا۔ جوش، مسرت اور تکمیل ذات کے ادراک کا احساس نیند کا دشمن بن گیا۔

صبح ہوئی تو یوں محسوس ہوا اس صبح سے زیادہ حسین صبح کبھی نہ ہوئی ہے۔ ایسی روشن اجلی کرنیں میں نے کبھی دیکھی نہیں تھیں اور اتنا ستھرا پاکیزہ ماحول کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

آج دل نے کہا۔ آج دفتر کی چھٹی کر لے۔ شاید نانی کو کوئی کام پڑ جائے۔ زکی دیر تک بستر پر اینڈتا رہا۔ وہ ڈیوٹی کر رہا تھا۔ اسے نانی نے بہت سے کام بتائے اور میرے لیے کہا تھا کہ میں کچھ نہ کروں۔ وہ سب کچھ کر لیں گی۔ وہ میری بھی سرپرست بن گئی تھیں۔ گویا مجھے چھٹی نہیں لینی چاہیے۔

کبھی کبھی ایک معمولی، چھوٹی سی غلطی بہت بڑے سانحے کا سبب بن جاتی ہے۔ زندگی کا رخ بدل دیتی ہے، توقعات کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ میں بھی ایک غلطی کر بیٹھا اس روز چھٹی نہ لے کر دفتر جا کر پھنس گیا۔

ذہن تو آج کی تقریب کی رنگارنگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کام کیا ہوتا۔ میز پر ٹانگیں پسارے ہاتھوں کی لکیروں کو گھورتا رہا۔

فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ کاش! میں نے فون نہ اٹھایا ہوتا۔ میں نے دفتر سے چھٹی کر لی ہوتی۔ میں لنچ ٹائم میں ہی چلا گیا ہوتا۔ میں یہ گھنٹی سننے کے لیے دفتر میں کیوں بیٹھا رہا۔ خواب بنتا رہا۔ خیالوں میں کھویا رہا۔ کاش، کاش میں نے وہ چھوٹی سی غلطی نہ کی ہوتی۔

♥ ♡ ♡ ♥

آج پانچ سال گزر جانے کے بعد میں اتنا ہی تہی دست، اتنا ہی محروم ہوں جیسا کہ نانی کالونی عرف ساسوں کی چھاؤنی کے سامنے والی بلڈنگ میں رہتے ہوئے خود کو محسوس کرتا تھا۔ میری محروم اور ناشاد زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آئی۔ لیکن وہ کسی طور میرے غموں اور دکھوں کو کم نہ کر سکی۔

میں اس حسین شام اور اس اجلی صبح کا ممنون ہوں جس نے چند گھنٹے میری زندگی کو خوشیوں سے ہمکنار کیا۔ تمناؤں کو بڑے البیلے رنگ دیے۔ مجھے ایک انوکھی اور ہوش ربا آسودگی کی لذت سے مالا مال کر دیا۔ وہ چند گھنٹے زندگی کا حاصل ٹھہرے۔ وہ سانولی شام اور وہ اجلی پُرنور صبح۔

پانچ سال کے بعد بھی میرے ذہن پر، میرے دل پر، میرے احساس پر اس شام اور صبح کے احسان ایسے ہی تازہ اور وزنی تھے جو میری گردن جھکا دینے کی قوت رکھتے تھے۔ اس شام اور اس نرالی صبح کے احسانات آج تک مجھے اپنا پابند بنائے ہوئے تھے۔ کیونکہ اس کے بعد پھر مجھے کبھی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ کسی صبح نے مجھے سرشار نہیں کیا اور کسی شام نے وہ ہیجان عطا نہیں کیا۔

اب میرے دن اداس اور راتیں بے چین گزرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے جب فرو اور مجی میں لڑائی ہوتی تھی تو مجیب میرے پاس آ کر دکھڑے روتا تھا۔

"یہ بھی کوئی زندگی ہے یار۔" وہ جھلایا ہوا رہتا تھا۔ "اس شادی سے تو میں کنوارا ہی بھلا تھا۔"

"میں کس سے کہوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے یار، اس سے تو میں کنوارا ہی بھلا تھا۔"

میں صبر کی صلیب پر چڑھ گیا تھا اور جب ایک بار

صلیب پر چڑھ ہی گیا تو زندگی کا شکوہ کون کرے۔ لوگ احسان کے بدلے زندگی چھین لیتے ہیں۔ تمنائیں نوچ لیتے ہیں۔ آرزوؤں کے پودے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ میری زندگی تلخیوں کا مرکب بن کر رہ گئی تھی۔ پتا نہیں اتنے برسوں کے بعد آج پھر کیوں میں اداس ہو رہا تھا۔ یہ اداسی تو میری رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی لیکن آج یادیں اور پچھتاوے مجھے بے کل کر رہے تھے۔ میں نے وہ چھوٹی سی غلطی کیوں کی؟

میں مضطرب ہو کر گھر سے نکل آیا۔

"ہے ہے انصار بھائی۔" آواز مانوس، چہرہ شناسا۔ میں چونک کر مڑا۔ میرے خدا! یہ کیا منظر ہے میرے سامنے، میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ نہیں جاگ رہا ہوں اور نور الدین زنگی اپنی سیاہ رنگت، مسکراتے چہرے اور پیر پھینکتی چال کے ساتھ میری طرف بڑھے آ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر حیران بھی ہوا اور مسرور بھی۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ تمکنت اور باوقار چہرے پر ہلکی تبسم کی لکیر لیے وردہ ہی تو تھی۔

تو گویا نانی نے مجھ سے مایوس ہو کر زنگی کو وردہ کا جیون ساتھی بنا دیا۔ عجیب سے کرب نے میری روح کو جکڑ لیا۔ وہ جو میری تھی، میری ہونے والی تھی۔ وہ زنگی کے ہمراہ مطمئن اور مسرور نظر آ رہی تھی۔ گو کہ جسمانی طور پر قدرے دبلی ہو گئی تھی۔

"اوہو انصار بھائی! آپ کی تلاش تو مجھے کولمبس بنا گئی۔ کدھر رہتے ہیں آپ، اسٹیشن سے مارا مار چلے آ رہے ہیں۔ کوئی سواری نہیں ملی۔ جس سے پوچھو وہ کہتا ہے آگے چلے جاؤ، بس ذرا دور اور یہ بس یہ ذرا دور تین میل ہو گیا۔" زنگی میاں بولے جا رہے تھے۔

میں اپنے گھر کے باہر چند قدم پر کھڑا تھا۔

"آخر کار ہم نے آپ کو ڈھونڈ ہی لیا۔" وردہ محجوب سی تھی۔

"چلیے گھر کے اندر، بھئی میں تو نہیں مگر یہ تو بہت تھک گئی ہیں۔" زنگی بولے۔

پہلے تو جی میں آیا انہیں ٹال دوں۔ دل بہت جل رہا تھا۔ آگ کے شعلے سینہ جلائے دے رہے تھے۔ پھر وردہ کی تھکن اور زنگی کی محبت و مروت یاد آ گئی۔

ہم کمرے میں داخل ہوئے تو زنگی نے سکون کا سانس لے کر کہا۔ "یہ آپ کی امانت تھی جو میں آپ کی چھت تلے پہنچا دی۔ سرخ رو ہو گیا۔"

"کیا مطلب؟" میں کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا۔

"داستان غریب وردہ۔ بہت لمبی نہ سہی مگر سننے کے لیے وقت تو چاہیے۔ آپ کی کہانی بھی سننے کے لائق ہے کہ آپ اتنے ہی مجبور تھے کہ وعدہ پورا نہ کر سکے اسی لیے یہ خود آ گئی ہیں۔ کھوجتی ہوئی۔"

"میں اکیلی رہ گئی ہوں، باباجی کا انتقال ہو گیا اور الفتی بھی سدھار گئیں۔ اس لیے اب اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔" وردہ نیچی نظر کیے کہہ رہی تھی۔ "کہ میں خود آپ کے پاس آ جاؤں۔ آپ میری چھت، میرا سائبان ہیں۔ یہ بات میں پانچ سال پہلے بھی اشاروں میں کہہ چکی تھی۔ میں آپ کی انتظار۔"

وردہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس کی شادی نہیں ہوئی وہ میرا انتظار کرتی رہی۔ وہ جو کمزور لڑکی ہے وہ تھپیڑوں میں طوفان کا مقابلہ کرتی رہی۔ صرف اس پر۔ وہ مجھے اپنی چھت 'اپنا سائبان' سمجھ کر تحفظ کی تلاش کے لیے میرے در پر آ کھڑی ہوئی تھی، یہ میری محبت۔ میں وعدے کی زنجیر کو توڑ کر اس محبت سے [illegible] ہوتا چلا گیا۔ کس کو پتا ہے میں نے کتنے دکھ سے عذاب بھگتا اور احسان کا بدلہ اپنی امنگوں بھری زندگی دے کر ادا کیا۔ میں نے اپنی جوانی قربان کر دی۔

"آؤ اندر آ جاؤ وردہ۔" میں اسے اپنے بیڈ روم لے آیا۔ جہاں ایک آرام دہ بستر پر وہ سانسیں پوری کر رہی تھی۔ میری دشمن۔ میری امنگوں اور آرزوؤں کی قاتل۔

"یہ میری بیوی اسماء ہے اور اسماء۔۔۔ یہ وردہ۔"

الفاظ میرے حلق میں پھنس رہے تھے۔ اسماء نے گردن اونچی کر کے اسے دیکھا۔ وردہ بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ حیران نہیں متاسف تھی۔ اسماء کی نظروں میں تجسس تھا۔

کئی برس پہلے جب میں دفتر میں پھر پیارے کی خوشیوں میں کھویا ہوا تھا۔ تب فون کی گھنٹی نے میری تقدیر بدل دی۔ میرا خالہ زاد بھائی کہہ رہا تھا۔ "انصار بھائی! فوراً آ جائیں۔ ماموں جان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ شدید زخمی ہیں۔ فوراً وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کچھ پتا نہیں رات گزرے کی یا۔"

ماموں جان جب میرے ماں باپ مجھے بھرے گھر اور دنیا چھوڑ کر آسمان پر چلے گئے ہمیشہ کے لیے، میں [illegible] ہوتا تھا۔ تب میرے چچا آ گئے تھے۔ انہوں نے مکان، دکان، گھر کے سامان کی تقسیم کر لی تھی۔ چچاؤں نے ابا کی ایک ایک چیز کو تقسیم کر لیا۔ [illegible] جان چیزیں زمین، دیوار، چھت اور سب کچھ لے کر بے حد خوش تھے۔ انہیں ابا کی اولاد جاندار، سانس لیتا آنسو بہاتا ہوا بیٹا نظر ہی نہیں آیا۔ انہوں نے دنیا کے سمندر میں تھپیڑے کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ میں اس گھر سے اس گھر، اس گلی سے اس گلی بھٹکتا رہا جب کوئی مجھے اپنانے کے لیے تیار نہ تھا، ماموں جان نے میرے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا وہ اپنے گھر لے آئے۔

گو کہ ممانی نے ناک چڑھائی، اسماء نے دھتکارا مگر ماموں مجھے ہر نفرت سے بچاتے رہے اور محبت لٹاتے رہے۔ انہوں نے مجھے تعلیم دلائی اور میرا سہارا بنے۔ میں برسر روزگار ہوا تو دو سال نانی کالونی کے سامنے کے گھر میں صبر و سکون سے وقت گزارتا رہا اور اب میری ناشاد زندگی میں خوشی کے لمحے آئے۔ میں نے سوچا تھا اچانک ہی وردہ کو ماموں کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دوں گا۔ وہ میری ہر خواہش کو پورا کرتے تھے۔ انہیں خوشی ہوگی۔ لیکن ماموں تو زخمی تھے اور اس وقت جب میں ذہنی طور پر دوراہے پر کھڑا تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔

میں فون کرتا رہا۔ مجیب دفتر سے جا چکا تھا۔ زنگی تو ان کے کاموں کی وجہ سے دفتر ہی نہیں گیا تھا۔ نازی بھی آفس میں نہیں ملا تھا۔ میں سر تھام کر رہ گیا۔ رات پتا نہیں ماموں رات گزار سکیں گے کہ نہیں ان کے احسانات، ان کی محبتیں، عنایتیں میرا دامن تھام کر مجھے اسٹیشن لے گئیں۔ میں کسی کو نہ بتا سکا کہ میں کہاں اور کیوں جا رہا ہوں۔ ذہن پر اتنا بار تھا، جذبات زخمی تھے۔ ایک طرف وردہ کا انتظار۔۔۔۔۔۔ مایوسی۔ نانی کی غلط فہمی کا خیال تھا۔ وہ سب مجھے دھوکے باز سمجھ رہے ہوں گے۔

دوسری سمت ماموں جان کی آخری بار صورت دیکھنے کو دل تڑپ رہا تھا۔ میں ٹرین میں بیٹھا سوچ رہا تھا، جاتے ہی ٹیلی گرام دوں گا اپنی مجبوری کا حال لکھ دوں گا۔

ماموں جان نے مجھ سے میری زندگی مانگ لی۔ اپنے احسان کا بدلہ، اسماء سے شادی، میں ان کی خوشی کے لیے وصیت کے مطابق مجبور ہو گیا۔ میں مجبور ہو گیا۔ اسماء مجھ سے دو تین سال بڑی تھی۔ اس میں کئی

خوبیاں تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انسانیت سے عاری تھی۔ تنگ دل، غصہ ور، بدمزاج اور کڑوی زبان کی مالک۔ اسے بچپن سے ہی مجھ سے چڑ تھی۔ اپنے والد کو میری طرف متوجہ دیکھ کر وہ جل بھن کر کوئلہ ہو جاتی تھی۔ ماموں جان اسے سمجھاتے تھے کہ میں بھی ان کا بیٹا ہوں۔

وہ چاہتے تھے کہ اسماء مجھ سے محبت کرے۔ اسی لیے انہوں نے یہ رشتہ جوڑا۔ اسماء باپ کی حالت دیکھ کر ڈر گئی۔ ان کی آخری خواہش رد نہ کر سکی۔ کیسا عجیب ناتا تھا ہمارا۔ نہ وہ مجھے برداشت کرتی تھی۔ نہ میں اس کو۔

پھر دو باتیں مختلف طریقے سے ظہور پذیر ہوئیں۔ ماموں جان زخموں کو جھیل گئے۔ زندہ بچ گئے اور اسماء مجھ سے محبت نہ کر سکی۔ اس کی نفرت بڑھتی گئی۔ اس نے مجھے بہت اذیتیں پہنچائیں۔ میری انا اور احساس پر ضربیں لگائیں، تحقیر کا برتاؤ کیا اور نفرت کا برملا اظہار کر کے مجھے خود سے بدول کر دیا۔

وہ بہت سنگدل، ظالم اور زہریلی عورت تھی۔ عمر میں مجھ سے بڑی تھی۔ اور اب تک خود کو برتر سمجھتی رہی تھی۔

پھر ہوا یہ کہ وہ ایک حادثے میں ٹانگوں سے معذور ہو کر بستر سے لگ گئی۔ میں جو ماموں جان کی مروت اور احسانوں تلے دبا ہوا ان کی بیٹی کو کسی طرح برداشت کر رہا تھا۔ اب تو میری قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی کہ یہ حادثہ ہو گیا اور مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی۔ اب بڑھاپے میں ماموں کو دکھ دینے کا خیال مجھے تکلیف دینے لگا اور میں مزید مجبور ہو گیا۔

پہلے تو اس کی نفرت ہی میرے لیے اذیت کا باعث تھی۔ اب وہ مزید چڑچڑی اور بدمزاج ہو گئی تھی مگر چونکہ وہ میری محتاج تھی اس لیے اب اس کو بھی میرا وجود برداشت کرنا پڑتا تھا۔ نوکر بھی اس کی بدمزاجی کے باعث نہ ٹکتے۔

میری زندگی جہنم کا نمونہ تھی اور میں کبھی کبھی سو کہ شاید یہ اس بدعہدی کی سزا ملی ہے جو میں سے کی تھی اور وردہ مرضی کے خلاف عفی کا نصیب ہو گی۔ یا پھر نانی نے اسے زنگی سے

لیکن نہیں، میرا انتظار ان سب کے لیے امتحان گیا۔ وردہ مایوس ہو کر بابا کے پاس چلی گئی۔ نانی امی بھی فوت ہو گئیں۔ وردہ مجیب کی زندگی کو تلخیوں بچانے کے لیے چلی گئی تھی کیونکہ فرو کو اب مجیب بہت شکایتیں ہو گئی تھیں۔

بابا کے انتقال کے بعد وردہ کو میرا وعدہ یاد آیا۔ اور میری تلاش میں زنگی سے ملی۔ پھر مجیب نے ماموں کا بتایا اور اب وہ میرے بیڈ روم میں موجود تھی۔ آرام دہ بستر میں لیٹی ہوئی میری بیوی کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اسماء اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

ایک روز انتہائی غصے میں، میں نے اسماء کو بتا دیا تھا کہ میں ماموں کے احسانات کی وجہ سے مجبور ہو گیا تھا ورنہ اس شام مجھے زندگی کی اصل مسرت ملنے والی ۔ وردہ جو میری محبت تھی، جس کے حالات زندگی میرے حالات سے مطابقت رکھتے تھے۔ اسماء کبھی اس کو، کبھی مجھے دیکھ رہی تھی۔

کافی دیر کی خاموشی کے بعد اسماء نے اچانک کہا۔ "تم مجھے اچھی لگیں۔ کیا تم انصار سے محبت کرتی ہو؟ میں جانتی ہوں تم اس کو وہ سب دے سکتی جو میں نہیں دے پائی محبت اور رفاقت۔"

اسماء کیا کہہ رہی تھی۔ وہ اتنی حساس تو کبھی نہ تھی۔ کیا وہ مجھ پر گزرنے والی قیامت سے واقف تھی۔

"ہاں! میں اسے کچھ نہ دے پائی محبت نہ...... رفاقت اگر کچھ دیا تو نفرت حقارت...... انصار نے مجھ سے شادی کر کے خود پر ظلم کیا ہے۔ ابا نے ہم دونوں پر ظلم کیا ہے۔ نہ میں اس کی عزت کر سکتی ہوں، نہ محبت بچپن ہی سے یہ مجھے ایک غاصب نظر آتا تھا۔ جو

ابا کی محبت میں حصہ بٹانے آ گیا تھا۔"

اسماء بولے جا رہی تھی۔

"اگر وہ خوش نہیں رہا تو میں کب...... خیر چھوڑو، اب تم اندر آ رہی تھیں تو میں نے انصار کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ہیرے کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کا چہرہ مطمئن تھا۔ میں نے کبھی اسے اتنا پُر سکون اور چاق و چوبند نہیں دیکھا تھا۔"

وردہ خاموش تھی، میں بھی...... کمرے میں صرف اسماء کی آواز تھی۔ اس کی سانسوں کا ہیجان، جذبات کا تلاطم وہ مشتعل تو نہیں تھی۔ شاید بے سکون ہو گی۔ رک کر پھر بولی۔ "یہ جاگتے میں بھی تمہارے خواب دیکھا کرتا تھا۔ مجھے معلوم ہے اور میں، میں بھی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم نے بہت دیر کر دی۔ مگر تم آ گئی ہو۔ اب میں بہتر طریقے سے موت کا استقبال کر سکتی ہوں۔"

"یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" وحشت زدہ ہو کر وردہ بول اٹھی۔ "خدا نہ کرے۔"

"میں اس کے احسانوں کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے چپ کی مار ماری ہے۔ اب اور نہیں جینا چاہتی۔ میں اتنا بوجھ اب نہیں سہ پاؤں گی۔ میری نفرت کے جواب میں یہ مروت سے پیش آیا۔ معذور ہونے کے بعد بھی اس نے مجھ سے نفرت نہیں کی۔ کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔"

اسماء بے تاب ہو گئی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا بازو تھپتھپانے لگا۔ اسے تسلی دینے لگا۔ آخر وہ میری بیوی تھی۔

اسماء کی آنکھوں سے سیلاب اشک رواں تھا۔ اس کی نفرت کا پردہ چاک ہو گیا تھا۔ وہ ایک عورت تھی۔ ایک بیوی تھی اور بس...... جو شوہر کی پہلی محبت سے خوفزدہ تھی اور اب خوف کا پردہ بھی گر گیا تھا۔ اس نے مجھ سے نفرت کی تھی تو میں نے کب محبت کی تھی اس سے، ہم نے برابری کا سلوک کیا تھا ایک دوسرے سے۔

"وردہ! اب تم کہیں نہ جانا، میرا یہ گھر اب تمہارا ہے۔" اسماء کا ہیجان کچھ کم ہوا تھا۔ وہ وردہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ "میں، میں خود تمہیں دلہن بناؤں گی۔ اپنے ہاتھ سے۔" اسماء کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ وہ دلیر ہو گئی تھی۔

"نہیں نہیں۔" وردہ گھبرا گئی۔

"جو میں نہیں دے سکی، وہ تم دے دینا انصار کو، محبت، چاہت، اور اولاد...... انصار نے بہت سزا کاٹی ہے، اسے محبت کہیں نہیں ملی۔ اس نے مجھ پر بہت احسان کیے ہیں۔ میں ان کے بدلے اسے ایک بیش قیمت تحفہ دینا چاہتی ہوں۔ بولو وردہ! تم وہ تحفہ بنو گی نا؟"

اسماء کے لہجے میں حسرت تھی۔ میں وردہ کا جواب سننا نہیں چاہتا تھا، میں محض ایک آدمی تھا۔ میں باہر آ گیا زنگی کے پاس۔

احسانات کی لمبی زنجیر کا ہر حلقہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ کبھی یہ زندگی چھین لیتے ہیں، کبھی خوشیاں لوٹا دیتے ہیں۔ نقصان میں کوئی نہیں رہتا۔ احسان کرنے والا، نہ احسان لینے والا۔

اب اسماء جو تحفہ مجھے دینا چاہتی تھی، اس کا احسان میری گردن کا بوجھ ہی تو بنے گا۔ پھر میں اسے کیا دوں؟ اس اتنے بڑے احسان، اتنے بیش قیمت تحفے کے بدلے میں۔

میرے پاس اسے دینے کے لیے محبت سے بڑھ کر کوئی صلہ نہیں ہے۔

ہاں! اس نے مجھے رہائی دینے کی نوید سنائی ہے، میں اسے محبت کی ہتھکڑی پہنا دوں گا۔

ہماری نفرتوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔